مقدمہ

مطالعہ سیرت کے تقاضے

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر مسلم اہلِ علم کی لکھی ہوئی ان کتابوں کے مطالعے کے بعد عمومی طور پر ایک بات محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ یہ کتابیں زیادہ تر تقدس کے جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ یہ طریقہ عقیدت مندانہ مطالعہ کے اعتبار سے اہم ہو سکتا ہے مگر اس طرز پر لکھی گئی کتابوں کی وہ اہمیت نہیں ہوتی جو علمی انداز سے قلمبند ہونے والی کتابوں کی ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت سے دلچسپی محض حصول ثواب کی خاطر ہو تو ایسی کتابوں سے ممکن ہے یہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن انسانیت کی ہدایت و ترقی کے لیے خیرِ امت کی ذمہ داری اس طرح کسی بھی صورت میں سر انجام نہیں دی جا سکتی۔ اس قسم کی مدحیہ تحریروں میں قاری کو صرف افتخار یا تقدیس کی غذا ملتی ہے، لیکن وہ رہنمائی نہیں ملتی جس کو قرآن میں اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔ ۲۱) کہا گیا ہے۔ اسی رہنمائی کے نتیجے میں مسلمانوں سے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (توبہ۔۳۳) کا وعدہ کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی گذشتہ ایک ہزار سالہ تاریخ غلبۂ اسلام کے بجائے غلامیوں اور ہزیمتوں کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان بنی ہوئی ہے۔ اس صورتِ حال کی وجوہات کے بارے میں امت کے اکثر روشن فکر اربابِ علم اس بات پر متفق رہے ہیں کہ ایک تو قرآن حکیم کی تعلیماتِ توحید سے روگردانی کی گئی ہے اور دوسرا پیغمبر اسلام کی بعثت کے اصل مقاصد اور طریقۂ نبوت سے انحراف کر کے رسمی مذہبیت اور جھوٹی تقدیس کو دین بنا دیا گیا ہے۔

سیرت کی زیادہ تر کتابیں مقاصدِ نبوت کو پیشِ نظر رکھنے کے بجائے برکت کے حصول کے جذبے سے ہی لکھی گئی ہیں۔ اس حوالے سے مولانا وحید الدین خان نے اپنی کتاب "سیرت کا مطالعہ" میں سیرت کے موضوع پر اک مشہور مصنف کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" کا حوالہ دیا ہے جس کے مقدمے میں صاحبِ کتاب لکھتے ہیں کہ:

"مولف کو معلوم تھا کہ سیرت کے موضوع پر لکھنے والوں نے بہت سی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ مگر مؤلف نے اس کو اپنی سعادت سمجھا کہ وہ سیرت کے عظیم موضوع پر ایک نئی کتاب لکھے اور اس طرح

وہ سیرت نگاروں کی اس نورانی لڑی میں شامل ہو جائے:

وکان یری السعادۃ فی تالیف کتاب جدید فی السیرۃ النبویۃ لینخرط فی سلک المؤلفین النورانی فی ھذا الموضوع الحبیب الجلیل۔ (صفحہ10)

ظاہر ہے کہ یہ مطالعے کا کوئی علمی طریقہ نہیں۔ اس طرزِ مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت کا موضوع مسلمانوں کے درمیان علمی وفکری ارتقا کا ذریعہ نہ بن سکا۔ وہ صرف عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین یا فخر ومباہات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔

موجودہ زمانے میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی نوعیت کی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے کتابِ فخر تو ضرور ہیں، مگر وہ حقیقی معنوں میں ان کے لیے کتاب اسوہ یا کتابِ رہنمائی نہیں۔

ہمارے سیرت نگار جب سیرت کے موضوع پر لکھتے ہیں تو وہ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ بعثت سے قبل عرب کی حالت کی نہایت تاریک تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ بعثت سے قبل سارا عرب تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے لوگ وحشی بنے ہوئے تھے۔ درجنوں عورتوں سے نکاح کر کے ان کو اپنے گھر میں رکھ لیا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں پیغمبرِ اسلام ﷺ کے کارنامے کو نمایاں کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب تک عربوں کو آخری حد تک برا ثابت نہ کیا جائے، پیغمبرِ اسلام ﷺ کی عظمت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ نہ صرف تاریخی حقائق کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن وحدیث کے بھی خلاف ہے۔

اس طرح کی باتوں کا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں میں علمی نقطۂ نظر پیدا نہ ہو سکا۔ مسلمان حقیقت پسند قوم بننے کے بجائے پر اسرار خیالات میں جینے والی ایک قوم بن گئے۔ کسی بھی حقیقت کو علمی اور تاریخی حیثیت سے سمجھنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ ان کے اکابر تک کا یہ حال ہے کہ وہ صرف پر اسرار اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہیں۔ سائنٹفک اصطلاحوں میں سوچنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اسلام ﷺ کو بہترین لوگوں میں پیدا کیا اس کی مزید تفصیل روایات میں آئی ہے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا پھر مجھ کو بہترین انسانوں میں اٹھایا (ان اللہ خلق الخلق فجعلنی فی خیر خلقہ)

(تفسیر ابن کثیر ۲/۳۷۱)

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ جن عربوں کے اندر مبعوث کیے گئے وہ اخلاق وکردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سب سے بہتر لوگ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ ایک ایسا انقلاب لائیں جس کی نظیر تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر عرب کے یہ لوگ ویسے ہی

برے ہوتے جیسا کہ ہماری کتابوں میں بتایا جاتا ہے تو اصحابِ رسول کی وہ اعلیٰ ٹیم ہی نہ بنتی جس کو قرآن میں خیرِ امت کہا گیا ہے (آل عمران۔۱۱۰) اور جس کی وجہ سے دینِ توحید کی عظیم تاریخ وجود میں آئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حدیث کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا (فتح الباری ۶/۷۷۴)

اخلاق و کردار کے حوالے سے تاریخِ اسلام کا یہ واقعہ اس تمام مبالغے کو رد کرنے کے لئے کافی ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جب ہر قل شہنشاہِ روم کو اسلام کی دعوت کا خط لکھا تو وہ خط سے متاثر ہوا اور اس نے ابوسفیان کو بلایا جو اس وقت شام میں مکہ کے ایک تجارتی کارواں کی قیادت کر رہا تھا۔ ہر قل اور ابوسفیان کے درمیان پیغمبرِ اسلام ﷺ کے متعلق جو مکالمہ ہوا وہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اگرچہ اس وقت ابوسفیان پیغمبرِ اسلام ﷺ کا سخت ترین دشمن تھا لیکن یہ ان کی اخلاقی کردار کی بڑائی تھی کہ وہ اس دشمنی کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور ان کی تحریک کے متعلق پوچھے گئے تمام سوالوں کے جوابات ٹھیک ٹھیک دے رہا تھا۔

تمدنی طور پر حقائق کو دیکھا جائے تو عربوں کے ہاں مکہ کی شہری ریاست تمام ضروری منظمات کے ساتھ موجود تھی جس میں عدالتی، فوجی اور انتظامی امور کا نظام قائم تھا، تاہم اس میں افراط و تفریط اور طبقاتی تضاد بہرحال موجود تھا جو ایک بڑی تبدیلی کا خواہاں تھا۔

مطالعۂ سیرت کے مذکورہ اسلوب نے پورے معاملے کو غیر علمی بنادیا۔ مثلاً ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ بعثت سے پہلے عرب کے لوگ درجنوں کی تعداد میں بیویاں رکھتے تھے۔ دوسری طرف انھیں کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ عرب اپنی لڑکیوں کو پیدا ہونے کے بعد مار ڈالتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس سماج میں لڑکیاں زندہ در گور کی جارہی ہوں وہاں عورتیں اتنی زیادہ تعداد میں کیسے پائی جائیں گی کہ لوگوں کو یہ موقع ملے کہ وہ لامحدود تعداد میں اپنے گھروں میں عورتیں رکھ لیں؟

امر واقعہ یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں نکاح کرنے کا رواج صرف کچھ سرداروں میں تھا، نہ کہ عام عربوں میں۔ اور یہ سردار بھی یہ عمل اس لیے کرتے تھے کہ مختلف قبائل سے رشتہ داریاں قائم کرکے انھیں اپنی سرداری کے تحت متحد کر سکیں۔ اسی رواج کو پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی اسلام کے حق میں استعمال کیا۔ آپ نے بھی مختلف قبائل کی خواتین کو اپنے نکاح میں لیا تاکہ ان قبائل کو جنگ کے بغیر اسلام کا حامی بنا سکیں۔

جہاں تک لڑکیوں کو زندہ در گور کرنے کا معاملہ ہے تو وہ صرف استثنائی طور پر بعض غریب قبائل میں تھا۔ عام عرب اس کو سخت معیوب سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ غریب خاندانوں کی مالی مدد کرتے تھے تاکہ وہ اس وحشیانہ رسم سے باز رہیں۔ ایک ہی صحابی کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قبل

از اسلام اپنی بیٹی زندہ در گور کرنے پر، بہت درد اور کرب میں مبتلا رہتا تھا اور تادمِ مرگ اس درد میں روتا رہا۔

علمی مطالعے کے بجائے عقیدت مندانہ مطالعے سے یہ نقصان ہوا کہ ہمارے سیرت نگار بہت سی ایسی حقیقتوں کو دریافت نہ کرسکے جو قرآن میں صراحتہً مذکور تھیں۔ ان میں سے ایک معجزہ نبی کا مسئلہ ہے۔ ہمارے سیرت نگار عام طور پر کثرت سے پیغمبرِ اسلام ﷺ کے معجزات کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر یہ پورا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جو پچھلے پیغمبروں کو دیے گئے تھے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ سے آپ کے مخالفین یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اگر تم پیغمبر ہو تو دوسرے نبیوں جیسا حسی معجزہ ہمیں دکھاؤ۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ لوگوں کی ہدایت کی امید میں یہ چاہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی معجزہ ظاہر کیا جائے۔ مگر قرآن میں آپ کی اس خواہش کو رد کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا: ”اور اگر ان کی بے رخی تم پر گراں گزر رہی ہے تو اگر تم ایسا کرسکتے ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے لیے کوئی نشانی (معجزہ) لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ بنو۔“ (الانعام۔۳۵)

دوسری جگہ قرآن میں اس مستقل پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے برعکس، پیغمبرِ آخرالزماں کو حسی معجزے نہیں دیے جائیں گے۔ قرآن کی درجِ ذیل آیت اس حوالے سے حتمی بیان کا درجہ رکھتی ہے:

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝۵۹ (بنی اسرائیل ۵۹)

”اور ہم کو نشانیاں (معجزے) بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی ان کو سمجھانے کے لیے۔ پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور نشانیاں ہم صرف ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں۔“

ہمارے ہاں جو غیر علمی رویہ اختیار کیا گیا اس کے پس منظر میں غالباً یہ نفسیاتی رویہ کارفرما رہا ہے کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کو حسی معجزے نہیں دیے گئے تو وہ پچھلے انبیاء کے مقابلہ میں کچھ کم ہو جائیں گے۔ اس لیے غیر واقعی طور پر انھوں نے آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ بہت سے معجزے وابستہ کر دیے۔ حالانکہ قرآن میں صراحتہً اس کی تردید موجود تھی۔

خود حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ آپ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جس طرح کے معجزے پچھلے نبیوں کو دیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں صحیح بخاری کی یہ حدیث قول فیصل

کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نبیوں میں سے ہر نبی کو ایسی نشانی دی گئی جس کو اس زمانے کے لوگ مانتے تھے۔ اور مجھ کو وحی (قرآن) کا معجزہ دیا گیا۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر ایمان لانے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو گی۔"

مامن الانبیاء نبی الا اعطی من الایات ما مثلہ امن علیہ البشر و انما کان الذی اوتیتہ وحیا اوحاہ اللہ الی فارجوان اکون اکثرھم تابعا یوم القیامۃ (فتح الباری ۸/۶۱۹)

اصل یہ ہے کہ جن واقعات کو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے معجزات کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ وہ سب نصرت کے واقعات ہیں جو ہر مومن کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور وہ پیغمبر اسلام کو زیادہ اعلیٰ اور افضل صورت میں دیے گئے۔ معجزہ ایک ایسے خارقِ عادت واقعہ کا نام ہے جو مخاطبین کے مطالبے پر پیش کیا گیا ہو۔ مثلاً عصاء موسیٰ کا معجزہ۔ مگر اس نوعیت کا کوئی معجزاتی واقعہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی زندگی میں ثابت نہیں۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت کو سمجھنے میں دوسری بڑی رکاوٹ محسنِ انسانیت ﷺ کو ایک ایسے مذہبی رہنما کا درجہ دینا بھی ہے جس کے مطابق حضور ﷺ بس چند اعتقادات، چند رسوم و عبادات، چند اوراد و وظائف، چند اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے اور آپ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر معاشرے کی عام خامیوں اور گندگیوں سے مبرّا ہوں اور ایسے لوگ طہارت، نماز، روزہ، نوافل و اذکار کے پابند ہوں۔ علاوہ ازیں یہ لوگ انفرادی اخلاقی حد تک اپنے اندر سنتِ رسول ﷺ پر قائم رہنے والے ہوں۔ سنت کے اسی محدود اتباع کے نتیجے میں خیرِ امت کے طور پر انسانیت کے لیے وہ تحریک اور اس کی سرگرمی پیدا ہی نہیں ہو سکی جو دنیا کے عظیم عملی انسان کے پیروکاروں کا وتیرہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح پیغمبرِ اسلام ﷺ انسانیت کی ہدایت و نجات کیلئے جس طرح سرگرداں اور سرگرم رہتے تھے تا آنکہ جبرئیل آکر کہتا تھا کہ "اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالو گے کیا؟ آپ ﷺ نے اس طرح خود کو اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف کر لیا تھا اور وہ استغنا اختیار کیا کہ تین تین دن تک گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ یہ ساری باتیں ہمارے لیے اتباع سنت کا مواد نہیں ہیں۔ ان کی جگہ پر مخصوص لباس جس میں مسواک کی جیب بھی لازمی لگی ہوئی ہو ہمارے لیے سنت کے اتباع کا بہت بڑا منہاج بن گیا ہے!

سیرتِ نبوی ﷺ کو سمجھنے میں تیسرا اہم پہلو قرآن کی فکری تعلیم کو نظر انداز کرنا ہے۔ قرآن کی اس بنیادی تعلیم کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے کہ اسلام معاشرے کی طبقاتی نہج کو تبدیل کر کے توحیدی معاشرہ قائم کرنے والی انقلابی تحریک تھی، اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اس تحریک کو ایسی بنیادوں پر ایسا استحکام عطا کیا کہ معاشرے کی طبقاتی نہج آئندہ کی تمام انسانیت کیلئے مذموم قرار پائی۔

انسانوں کی اجتماعی زندگی، تمدن اور معاشرے کی ایسی تشکیل جس میں تمام انسانی غلامیوں کا خاتمہ، نیکی، عدل و انصاف، اور تمام انسانوں کو رزق کے وسائل مہیا کرنا انسانوں کی مشترکہ ذمہ داری ہو، یہ تمام کام نبوت کے مقاصد سے خارج کردیے گئے ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق، امن و آشتی اور سماجی انصاف کے ذریعے افراد کے انسانی جوہر کی ترقی اور کامرانی کے ذرائع جن سے انسانیت حَسَنَةً فِي الدُّنْيَا کے ذریعہ حَسَنَةً فِي الْآخِرَةِ (بقرہ۔۲۰۱) سے بھی بہریاب ہوسکے آج ہمارے ہاں دین کے کام کا حصہ نہیں رہے اور صرف سیکولر لوگوں کے کرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

قرآن میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذات اور مشن کو نہایت پر عظمت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء۱۰۷)

یعنی "ہم نے تم کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ اپنے مشن کے ذریعے ایک ایسا کارنامہ انجام دیں گے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رحمت کا سبب بن جائے۔ لیکن سیرت نگاروں نے سیرت کے حوالہ سے اس رحمت کو بھی پیغمبرِ ﷺ کے قائم کردہ نظام کے بجائے ان کے معجزات میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے مشن کے بارے میں قرآن حکیم نے صاف کہا ہے کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ (آل عمران۔۱۶۴)

"بلاشبہ یہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو انھیں میں سے ہے۔ وہ اللہ کی آیتیں سناتا ہے، ہر طرح کی برائیوں سے پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے (اس نے ہدایت کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے گمراہی میں مبتلا تھے۔"

تعلیماتِ قرآن کے ذریعے انسان کی سربلندی، انسان کا تزکیہ و شخصی ارتقا اور حکمت کے ذریعے تعمیر و تسخیرِ کائنات نبوت کے مقاصد قرار دیے گئے۔ پھر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک برتر نظام کے ساتھ جماعت کی تشکیل / پارٹی ڈسپلن اور اس کی خوبیاں قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمائیں:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ (الفتح۔۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔"

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

(التوبہ ۳۳)

"اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت او دینِ حق کے ساتھ تا کہ اس کو سارے دین پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی نا گوار ہو۔"

قرآن کی ان آیتوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی بعثت کوئی سادہ بات نہ تھی۔ وہ ایک عظیم انقلابی منصوبہ تھا۔ آپ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو ایک عظیم واقعہ ظہور میں لانا تھا، ایک ایسا واقعہ جو پوری انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دے۔ لیکن سیرت کی عام کتابیں پیغمبر کے اس عظیم کارنامے کی تصویر نظر نہیں آتیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر اور ایک عظیم رہنما کی حیثیت میں اپنے دور کی تمام انسانی غلامیوں کا خاتمہ کر کے، توحید کی بنیاد پر ایک نئے عالمی نظام کو ایک منظم جماعت کی تشکیل سے نہ صرف جزیرۃ العرب میں غالب کیا بلکہ اس وقت کی دو بڑی غاصب سلطنتوں قیصر و کسریٰ کے نظامِ استبداد کی ہلاکت کی بنیادیں ڈال دیں۔ اس کے بعد انسانی حقوق، آزادی، جمہوریت، مساوات اور انسانی اور فلاح و سعادت کا ایسا دور شروع ہوا جس سے پوری انسانیت پیغمبر اسلام ﷺ کی رحمۃ للعالمینی سے فیضیاب ہوتی رہی۔ اب یہ فلاح و سعادت صرف انسانوں کی اس زمینی حیات سے تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ اسی زمینی حیات کے افعال و اعمال پر معاد (آخرت) اور مستقل حیات کی فلاح و سعادت منحصر ہوئی۔ اور اسی سے امر خیر اور حسنِ عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی دائمی سعادت کی زندگی بھی انسانوں پر آشکار ہوئی۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی اسی سیرتِ طیبہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے زندگی کا بہتر نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد لیظہرہ علی الدین کلہ کی ذمہ داری اب خیرِ امت پر ہے جو اسی اسوۂ حسنہ پر مذکورہ ذمہ داری کو سرانجام دے گی۔ اگر یہ امت انھی مقاصد اور منشائے خداوندی کے تحت یہ کام سرانجام نہیں دے گی تو طرح طرح کے امراضِ قلوب ان کی زندگی کو مستقل روگ بنا دیں گے۔ ہم مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ اس قسم کے روگ اور دکھوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم نے ان امراض کی مسیحائی فضائل میں بھی تلاش کی ہے، اور اوراد و وظائف میں بھی، صلوٰۃ و سلام سے بھی مداوا چاہا ہے اور ختمِ بخاری سے بھی۔ زندگیوں کو پارسائی کے مخصوص قالب دینے کی کوششیں بھی کی ہیں اور اپنی پسند کی فرمانبرداریوں کے جالے بھی بنے ہیں ۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود ہمارے فرمانبرداری کے معیار ہماری سمت کو درست نہیں کر سکے ہیں ۔ یہ سب کوششیں ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی جماعت کا وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ، (الفتح۔۲۹) نہیں بنا سکی ہیں۔ اسوۂ حسنہ کے مطابق اس عملِ صالح کی توفیق نہیں دے سکیں جو ہماری مغفرت اور اجرِ عظیم یعنی ہماری نجات اور کامرانی کا باعث بن سکے۔

ہماری نجات اور کامرانی کا صرف یہی حل ہے کہ ہم قرآن کو مطلوب اسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی جییں یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہماری انفرادی اور ملی زندگی کے راستے ہم پر آسان

ہو جائیں گے۔ سچ کہا ہے امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد نے کہ:

"اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے۔ اور جب تک دنیا باقی ہے صاحبِ قرآن کی سیرت و حیاتِ مقدس کے مطالعے سے بڑھ کر نوعِ انسانی کے تمام امراض و عللِ ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔" (رسولِ رحمت ص ۱۳)

قرآن حکیم کی بتائی ہوئی پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت کے تین مرکزی نکات مثالی کردار، عظیم پیغام اور جہد و استقامت اس طرح تکوں بنے ہوئے ہیں کہ اس کا ہر کونہ اپنی بستگی کو ضیاپاشی عطا کر رہا ہے۔ ان تینوں کونوں سے ہی اسلامی انقلاب کی عظیم تشکیل کا رنگ ساری انسانیت نے دیکھا۔ اس لیے سیرت کے مطالعے میں ان تینوں عنوانات کو سمجھنے کی بے حد ضرورت ہے۔

مثالی کردار

داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبد اللہ ﷺ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ با اخلاق، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والے، حلیم و بردبار، صادق و امین، جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی اور دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کا نام "الامین" رکھا تھا۔ (خصائص کبری جلد ا ص۹۱)

شباب کی عمر کو پہنچے تو مکہ میں آنے والے مسافروں کی خبر گیری، مساکین کی امداد اور مظلوموں کی مدد کو اپنا شعار بنالیا۔ نوجوانوں کا ایک گروپ تشکیل دیا جو یہ کام مشنری اسپرٹ سے کرتے رہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حکم بن حزام اس گروپ میں ساتھ تھے۔ فجار کی لڑائی کی وجہ سے سیکڑوں گھرانے برباد ہوئے اور ہر سُو انار کی پھیلی ہوئی تھی۔ اس صورتِ حال سے تنگ آکر کچھ خیر پسندوں نے اصلاح کی ایک تحریک شروع کی، آنحضرت ﷺ کے ایک چچا زبیر ابن عبد المطلب کے تحرک پر عربوں کا ایک کنونشن "حلف الفضول" کے نام سے منعقد ہوا۔ نوجوانوں کی طرف سے حضرت محمد ﷺ نے اس میں بھرپور کردار ادا کیا۔ چنانچہ یہ معاہدہ ہوا کہ ہم:

(۱) ملک سے بد امنی دور کریں گے

(۲) مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے

(۳) غریبوں کی امداد کریں گے

(۴) مظلوم کی حمایت کریں گے

(۵) کسی ظالم کو مکہ میں نہ رہنے دیں گے۔

متشدد قبائلی عصبیت کے سماج میں غریبوں کے معاشی استحکام کی منصوبہ بندی اور ہر مظلوم کی حمایت کا عہد خواہ مظلوم کوئی بھی ہو۔ یہ ایک غیر معمولی تحریک اصلاح اور نظام کی تبدیلی کی جستجو تھی۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ اس معاہدے میں سرگرم شرکت پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ اگرچہ عربوں کی انتقامی اور عصبی جاہلیت نے بعد میں اس معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا جب خود حضور ﷺ کی مخالفت میں ظالم و مظلوم کا امتیاز بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ لیکن پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اسلامی فکر سے عالمِ انسانیت کو جو مستقل اقدار عطا کیں اس سے ان قدروں کو انسانیت کے لیے دائمی ورثے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ ذریعۂ معاش کے لئے قریش کے تجارتی سلسلہ میں شامل ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کے حسنِ معاملہ اور دیانتداری کے ہر طرف چرچے ہونے لگے جس کی وجہ سے ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنے کاروبار میں حضور ﷺ کو بھی شریک کرے۔ آپ کی شخصی دیانتداری اور حسنِ معاملہ کا وہ اعلیٰ معیار تھا جس کی بنا پر قوم نے متفقہ طور پر آپ ﷺ کو "امین" کا لقب دے دیا۔ قبل از نبوت روزانہ کی عام زندگی میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کے جو معمولات تھے اس میں اپنے گرد موجود سماج کی اصلاح کے لیے تفکر اور عملی کوششوں کی روداد پر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں تمام تفصیل کے ساتھ واقعات مذکور نہیں ہیں۔ شاید قبل از نبوت کی پیغمبر اسلام کی بھرپور سماجی زندگی کو نبوت سے علاحدہ دنیوی کاموں میں شمار کر کے ان کو سیرت کی کتابوں کا حصہ بنانا ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود سیرت کی کتابوں میں جمع شدہ واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی اس متحرک سماجی زندگی کا بھی ایک واضح عکس ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

مثلاً پہلی وحی کی آمد کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ جب اضطراب کی حالت میں گھر پر تشریف لائے تو بی بی خدیجۃ الکبریٰ نے اطمینان دلاتے ہوئے جن الفاظ میں شہادت دی تھی، تاریخ نے ان الفاظ کو سیرت کے کئی پہلوؤں کا مینار بنا دیا ہے۔ بی بی خدیجۃ الکبریٰ کی شہادت ان الفاظ میں تھی:

"اللہ کی قسم! آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی بے مدد نہیں چھوڑے گا۔ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور جائز ضرورتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔" (الرحیق المختوم ص۹۹)

بی بی خدیجۃ الکبریٰ کی پندرہ سالہ رفاقت کی یہ شہادت پیغمبرِ اسلام ﷺ کی قبل از نبوت سماجی زندگی کا جامع اور بھرپور تعارف ہے۔ آپ ﷺ اپنے سماج کو بدلنے، انسانی غلامیوں سے نجات دلا کر ان کو ایک اللہ کی عبدیت میں لانے کے لیے ایک طرف غار حرا کی تنہائیوں میں غور و فکر کر رہے ہیں اور دوسری طرف سماج میں اپنے ایک مؤثر عملی انسان دوست کردار سے سماج کی تبدیلی کے کام کا آغاز کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ یہی وہ عملی کردار تھا جس کو لیکر پیغمبر اسلام ﷺ صفا کی پہاڑی پر

کھڑے ہو کر مکہ کی آبادی کے لوگوں کے درمیان پیش کرتے ہیں کہ (میری چالیس سالہ زندگی کے کردار کی روشنی میں) بتاؤ۔ اگر میں یہ خبر دوں کہ پہاڑی کے پیچھے اک لشکر تمہاری تباہی کے لیے کھڑا ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ اس وقت تمام موجود لوگوں نے بیک آواز کہا تھا کہ "ہاں! تم امین و صادق ہو ہم تمھاری بات سچ مانیں گے۔" پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اس وقت دعوت الی اللہ کے لیے کسی معجزے کے بجائے اپنے کردار کو پیش کیا، حالانکہ صاحب نبوت کی حیثیت سے وہ کوئی بھی خرقِ عادت واقعہ رونما کر کے اپنی صداقت کا یقین و اعتقاد حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ ایک نئے دور کو جنم دینے والے تھے جس میں کردار و عمل کی اصل اہمیت ہوگی، اس لیے اپنے اسی کمال معجزہ کے ساتھ صفا کی پہاڑی پر اعتماد کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور اپنے تمام دعوتی متبعین کے لیے یہ مثال قائم کر دی کہ آنے والے دور میں انسانوں کے درمیان معجزوں اور کرامات کی بنیاد پر نہیں جانا ہوگا بلکہ انقلاب اور تبدیلی کے لیے وہی اشخاص انسانوں کے درمیان جا سکیں گے جن کے پاس عمل اور کردار کی ٹھوس بنیادیں ہوں گی۔ اور یہی عمل اور کردار ان کی کامرانیوں کا پیش خیمہ بنے گا۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ کے اسی کردار کا قرآن مجید بھی اس طرح ساکھی بنا کہ نبوت ملنے کے بعد جب ہر طرف سے مخالفت کا ہجوم اُمڈ آیا، تو لوگ آتے اور آپ کے دعویٰ کا ثبوت طلب کرتے تو حضور ﷺ فرماتے کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس۔۱٦)

"میں اس سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر بسر کر چکا ہوں، پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟"

میں نے تمہارے درمیان اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت نہیں؟ کیا تم میری اس چالیس سالہ زندگی میں جس کا ایک ایک لمحہ تمھارے درمیان بسر ہوا ہے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش کر سکتے ہو جس سے میری صداقت کے متعلق ذرا سا شبہ گزرے؟ یہ چیلنج پوری قوم کو دیا گیا اور اس کے خلاف کسی نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ کسی کے آئینہ صفت ہونے کی اس سے بڑھ کر شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں کے ہجوم میں خود بسر کی گئی زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا جائے اور اس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جائیں۔

عظیم پیغام

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے کسی اعتقاد، کسی نظریے اور کسی نقشۂ فکر کے بغیر اصلاح و تعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہیں تھا، کوئی ذاتی ولولۂ خام نہ تھا، بلکہ حضور ﷺ کون و مکان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کر اٹھے تھے۔ انتہائی حساس قلب کے ساتھ برسوں حضور ﷺ نے

زندگی کے رمز و معنی کو پانے کی جستجو کی تھی، غارِ حرا کی خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرونی عالم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صلاح و فساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی دماغ کھپایا، لیکن عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جب تک علمِ الٰہی نے آپ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا اور سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپ کے سامنے بے نقاب نہیں ہوگئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک مالک ہے اور انسان اس کا بندہ ہے۔ یہ توحید کا مژدہ ایک نئے نظام کی بنیاد تھی۔ انسانی آزادیوں کا ایک ایسا اعلان کہ مکہ کے سردار، رئیس، دولتمند اور مذہبی پروہت اس اعلان سے بدک گئے۔ مکہ کے یہ طبقات تمام انسانوں کو ہر قسم کی غلامیوں سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی اور غلامی میں لانے کے اس اعلان سے مشتعل ہوگئے۔ انھوں نے الوہیت کے حقوق خدائے واحد سے الگ کر کے اپنے درمیان بانٹ رکھے تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشیں، خاندان اور برادری کی رسمیں، نسلی، قومی اور قبیلائی روایات، جاگیردار اور برہمن طبقوں کی بالادستی، شاہی خاندانوں اور درباری اشرافیہ کی کبر پسندی (جس کو قرآن نے مُسْتَكْبِرِيْنَ (المؤمنون۔٦٧) کا نام دیا ہے)۔ یہ مختلف طبق بر طبق الوہیتیں تھیں جن کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا۔ عام لوگ غلامانہ انداز سے ان طبقات کی اناؤں، مفادات، اور خواہشات کی تکمیل کے لیے کولھو کے بیل کی طرح کی زندگی جیتے رہے تھے۔

توحید ان تمام مروجہ الوہیتوں کے انکار کا پیغام تھا جو غلامی کی ان تمام بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبدیت کی نئی عمارت کھڑی کر رہا تھا۔

اہلِ مکہ توحید کے پیغام میں مضمر انسانی آزادیوں، حریت اور مساوات کی اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے اس لیے وہ صفا کی پہاڑی پر یہ پیغام سنتے ہی سیخ پا ہوگئے۔ اگر یہ پیغام محض چند عقائد و عبادات کے طریقہ کار پر مشتمل ہوتا یا انفرادی زندگی کے کچھ اصلاحی و اخلاقی طریقوں کا مجموعہ ہوتا تو اس پر اہلِ مکہ یہ ردِ عمل ظاہر نہ کرتے۔ کیونکہ ان کی اکثریت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مورثِ اعلیٰ مانتی تھی۔ نماز، روزہ اور عبادت کا ایک سسٹم بھی ان کے ہاں موجود تھا اور عبادات کے اس سسٹم کی اصلاح ان کو اس انتہائی ردِ عمل تک نہیں لے جاتی کہ وہ مکہ کے ایک بااثر خاندان کے بے حد نیکوکار شخص کے قتل پر بھی آمادہ ہوگئے۔ اصل میں توحید کا پیغام توہمات اور غلامیوں اور طبقاتی تضاد کے پورے سماج کی تبدیلی کا پیام تھا اور اس کے لیے ان کا ردِ عمل بھی اس کے مطابق تھا۔

جب مُسْتَكْبِرِيْنَ اور مُتْرَفِيْنَ (غاصب و آمر رؤسا اور دولتمند) طبقوں کی اقلیت احبار و رہبان یعنی مذہبی پیشہ ور طبقوں کے تعاون سے مُسْتَضْعَفِيْنَ یعنی کمزور اکثریت پر اپنے خدائی اختیار کی حد تک غاصب بنی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ کی مشیت نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اسی طرح اس سماج کو بدلنے کا ارادہ فرمایا جس طرح نمرود و فرعون اور قارون کے استبداد و غلامی سے انسانوں کی آزادی کا حضرت

ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے نجات اور ہدایت کا بندوبست فرمایا تھا۔ قرآن میں پیغمبروں کے تاریخی پس منظر سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبوت اور انبیا کی بعثت کا مقصد دراصل غلام اور آقا پر مشتمل معاشرے کی ہیئت ترکیبی کو بدلنا تھا۔ یعنی توحیدِ الٰہی کے نظریے کو عمرانی لحاظ سے معاشرے پر منطبق کرتے ہوئے متضاد معاشی طبقات کے معاشرے کو ختم کرکے توحیدی غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنا تھا، جو خوف یعنی جنگ و فساد اور بغاوتوں اور رہزن یعنی غربت، بھوک، ناداری، جہالت اور غلامی سے پاک معاشرہ ہو۔

توحید کا پیغام واشگاف الفاظ میں یہ اعلان تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں، کسی کی بالادستی قبول نہیں، کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں، کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں، کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہیں کی جائے گی اور کسی کے اشارۂ ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا اور خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ سب انسان بنیادی انسانی حقوق میں یکساں ہونگے۔ سب انسانوں کو اللہ کے عیال کی حیثیت حاصل ہو گی۔ سب کو ایک جیسا انصاف مہیا ہو گا۔ سب کی بنیادی انسانی ضرورتیں مساوی ہوں گی۔ فخر و کبر کی تمام روایتیں ختم ہوں گی۔ اب اکرام و عظمت کی بنیاد صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق کی بنیاد پر ہو گی جو اس کے قوانین کا احترام کرے گا وہی محترم ہو گا۔ جو لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی گزاریں گے، اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں وہی لوگ فلاح پائیں گے۔

اس کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور سماج کی اصلاح کے لیے واحد ذریعہ وہ سلسلۂ نبوت و رسالت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعہ آیا ہے اور اسی سے عقلِ انسانی کو سوچنے کے رہنما اصول ملتے ہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی سلسلۂ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اب اسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر توحید کے اسی مفہوم کے ساتھ یہ خیرِ امت انسانوں کو فلاح و کامرانی عطا کرنے کی ذمہ دار بنائی گئی ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دینِ حق کی تعلیم دی اس کا مقصد صرف ظاہری عبادات و رسوم کی ادائیگی اور مساجد کی تزئین و آرائش کرنا نہیں تھا، بلکہ دنیا سے بلالحاظ مذہب و ملت، جہالت، غربت و افلاس، قتل و غارت گری، جنسی آوارگی، شراب نوشی و قمار بازی، محنت کے استحصال، مذاہب کے درمیان نفرت و جارحیت اور فساد و بدامنی کا خاتمہ کرنا تھا۔ اسلامی انقلاب ایک انٹرنیشنل تحریک تھی اور معاشرے کی اس تبدیلی کا مقصد یہ تھا کہ فرد اپنی مادی جسمانی ضروریات سے مطمئن ہو کر اپنا یقین اللہ پر قائم کرنے کے قابل ہو جائے۔ تاکہ وہ وعدہ کی گئی اپنی سعادت و راحت ، فلاح و کامرانی کی ابدی زندگی کو پاسکے جہاں وہ خالقِ کائنات اللہ کی ذات سے راضی ہو اور اللہ اس سے

راضی ہو۔

جہد و استقامت

جہد و استقامت پیغمبر اسلام ﷺ کی عملی زندگی کا تیسرا اہم معیار ہے۔ جس کام کو سرانجام دینے کا آپ نے بیڑہ اٹھایا اس کو جہد و سرگرمی کی انتہائی کوششوں سے کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ دعوت کے کام سے لے کر اسلامی انقلاب کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو ختم کرنے تک اور غارِ حرا کے پہلے پیغام سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک، ہر لمحہ اسی دعوت کی فکر تھی اور اسی دعوت کی تڑپ تھی۔ مکہ کی گلیوں میں رات دن ایک کر کے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا، عکاظ کے میلوں کا گشت، طائف کے کوچہ و بازار میں خون آلود ہونا، بدر و حنین کے معرکے اور جزیرۃ العرب کو سلامتی کی آماجگاہ بنانا غرض ایک ایک لمحہ سخت جہد و استقامت کا لمحہ ہے۔

مکہ میں دعوت کے ابتدائی دنوں میں صعوبتوں و آلام کی جو صورتِ حال تھی اور بادِ مخالف کا جھکڑ، سرکشوں اور مستبد قوتوں کا گھیراؤ ہر وقت زندگی کا چراغ گل کرنے کے درپے تھا۔ جب چچا ابوطالب نے اس گھیراؤ کو تنگ محسوس کیا اور بھتیجے کو توحید کے پیغام میں مصالحت کی پیش کی تو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر لغزش نہیں آئی۔ آپ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ:

”چچا جان! خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں کہ میں اس کام کو اس کی انتہا تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں، یہ ممکن نہیں۔“

توحید کی دعوت کے لیے قسم قسم کی صبر آزما اور جگر گداز وادیوں سے گزرنا پڑا۔ یہ دعوت ہر طاغوتی مستبد قوت کے خلاف اعلان جنگ تھی۔ لیکن پیغمبرِ اسلامؐ تنہا ان سب کی مخالفت کا مقابلہ کرتے رہے۔ پھر اس کشمکش میں فریب کاریوں اور سوقیانہ جملہ بازیوں سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس داعیِ حق و صداقت نے ان حملوں کے مقابلے میں اخلاق و شائستگی اور تہذیب و اصول پسندی کا دامن نہیں چھوڑا۔

مخالفین آپ کے کھلے دشمن تھے، اس لیے دنیا کے عام معیاروں کے مطابق، ان کے ساتھ آپ کا تعلق، انتقام اور عداوت کا تعلق ہونا چاہیے تھا۔ لیکن آپ ﷺ کا ان کے ساتھ تعلق اس قسم کا نہیں تھا۔ آپ کا ان کے ساتھ ایسا ہی تعلق تھا جیسے کسی طبیبِ مشفق کا مریض سے ہو۔ آپؐ دیکھتے تھے کہ ان کی انسانیت مجروح ہو چکی ہے، اس لیے آپ چاہتے تھے کہ ان کا علاج ہو جائے۔ لیکن ان کی ضد اور سرکشی ایسا ہونے نہیں دیتی تھی۔ اس لیے وہ اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ یہ طبیبِ مشفق جانتا تھا کہ ان کا مرض انھیں کسی نہ کسی طرح ہلاکت و تباہی کی طرف کھینچے لیے جارہا ہے۔ اس لیے ان کی ضد پر آپ کا دل کڑھتا تھا اور ان کی گمراہی کا غم آپ کو بے چین کیے دیتا تھا۔ قرآن اس کی شہادت ان الفاظ

میں دیتا ہے:

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ (النمل ۷۰)

"(اے پیغمبر!) ان کے اوپر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ یہ لوگ خفیہ تدبیریں کرتے ہیں، ان کی وجہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کرو۔"

پیغمبر اسلام ﷺ کو ان تکالیف سے زیادہ اپنے اس مشن کی کامیابی کی امید تھی جس میں انسانیت کو معرفت خداوندی کے ذریعے فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہونا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کی ایک عظیم جماعت تشکیل دی جن کی منظم طاقت سے ایمان، دعوت و جہاد کی اعلیٰ حکمت عملیوں سے عظیم مقاصد حاصل کیے گئے۔ اور توحید کی عالمگیر ترویج و اشاعت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو ہٹا دیا گیا۔

انسانی آزادیوں اور مساوات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میثاقِ مدینہ کے ساتھ ایک ربانی سماج وادی جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی جس کے ذریعے قرآن حکیم کے انسانیت کی فلاح و کامرانی کے بتائے ہوئے اصولوں کو عملی شکل میں لا کر امن و آشتی اور فلاح و کامرانی کا مثالی نظام قائم کیا گیا۔ اس طرح پیغمبرِ اسلام ﷺ کی قائم کردہ جماعت کے ذریعے پوری انسانیت کو پیغام دیا گیا کہ آنے والوں ادوار میں استحصال و غلامی، ظلم و جبر اور آمریت کی بنیاد پر کوئی بھی نظام انسانیت کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا۔

سیرت کے متذکرہ جامع پہلوؤں کی روشنی میں برصغیر کے اندر گذشتہ چند دہائیوں میں کسی قدر جو تحقیقی کام ہوا ہے، ان میں شیخ الاسلام مولانا محمد میاں کی کتاب "محمد رسول اللہ۔ قرآن و تاریخ کے آئینے میں"، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتاب "رسول رحمت"، مولانا پروفیسر محمد اجمل کی کتاب "رسولِ عربی"، ڈاکٹر الطاف جاوید کی کتاب "انقلابِ مکہ، سیرت نبوی نزول قرآن کی روشنی میں"، مولانا وحید الدین کی کتاب "پیغمبرِ انقلاب" اور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب "پیغمبر اعظم و آخر ﷺ" اردو زبان کی قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔ اس میں اوّل الذکر چار کتابیں مقاصدِ نبوت اور قرآنی فکر کا جامع علمی استفادہ ہیں اور آخر الذکر دونوں کتابیں طریقۂ نبوت کا عمدہ بیان ہیں۔ موجودہ دور کے ان محققین کے لیے جو اسلام کے ربانی، سماج وادی، انقلابی فکر سے آشنا ہیں، سیرت کے اساسی مآخذات کے ساتھ مذکورہ کتابیں ایک مبسوط جامع سیرت لکھنے کے بہتر عصری ماخذ ہیں۔

حال ہی میں کراچی میں قائم حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ میں قرآن حکیم کی اعلیٰ تعلیم کے کورسز کے لیے ایک جامع سیرت کی کتاب کی ضرورت پیش آئی تو شیخ الاسلام مولانا محمد میاںؒ اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی سیرت پر تحقیق کی گئی دو کتابوں کے اختصار اور حکیم الاسلام مولانا عبید اللہ سندھی کی تفسیر سے اشاراتِ سیرت کا انتخاب کر کے یہ "جوامع السیرت ﷺ" کتاب مرتب کی گئی

ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ کے طلبہ کے علاوہ سیرت النبی کے موضوع پر دیگر محققین و قارئین کے لیے بہتر استفادہ کا ذریعہ بنے گی۔ اور یہ کوشش اس روایت کی بنیاد بنے گی کہ سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ صرف و محض برکت حاصل کرنے کا ذریعہ نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی روشنی میں تبدیلی کے لیے اپنے کردار کا تعین کیا جائے اور اس ضمن میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے اور اس طرح اسلامی انقلاب کی اساس و استحکام کے فکری و عملی، اجتماعی طریقوں کا شعور پختہ کیا جائے۔ اس وقت اسلامی دنیا میں اسلامی تحریکیں جس اضطراب اور فکری کشمکش سے گزر رہی ہیں، ایسے میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سیرت اور اسلامی انقلاب کی ربانی، سماج وادی بنیادیں ان تحریکوں کے لیے روشنی کے مینار ہیں۔ اگر اندھی تقلید اور روایتی عقیدتوں کو ترک کر کے تبدیلی کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کیا جائے اور ایمان کے قرآنی معیار کو حاصل کیا جائے تو اسلام کی ترویج اشاعت اور فروغ کے امکانات روشن سے روشن تر ہو جائیں گے۔ اگر مسلمان بھٹکتی انسانیت کو اب بھی ربانی، سماج وادی نظام کی برکتوں سے فیضیاب کرنے کی ذمہ داری سے محروم رہتے ہیں تو یہ ان کی بدنصیبی ہو گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پوری انسانیت کے لیے بھی بڑے خسارے کی بات ہو گی اور پھر یاد رکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ ربِّ کائنات اپنا کام روکتا نہیں بلکہ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَهُمْ (محمد:۳۸) اس کا اصول ہے۔ وہ یہ کام کسی اور افراد اور ذریعے سے بھی کر سکتا ہے۔

ابو الفضل نور احمد
ڈائریکٹر
حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ